جناب مظفر عباس

اسلامی ریاست کی تشکیل اور علامہ اقبالؒ کا نقطۂ نظر

مارچ ۱۹۰۵ء کے "مخزن" میں علامہ اقبال کی نظم "نیا شوالہ" شائع ہوئی تھی۔ اس نظم کے یہ اشعار قابلِ توجہ ہیں:

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے — تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا — جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا — واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے — خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

یہ ایک طویل نظم ہے اور اس کا مرکزی خیال وطن کی سربلندی کے لیے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت ہے۔ شاعر کی خواہش ہے کہ وہ ایک ایسا شوالہ تیار کرے جس میں برہمن گلے میں زنار کے ساتھ ساتھ ہاتھ میں تسبیح بھی لیے ہوئے ہو، اور آوازۂ اذان اور ناقوس کی لَے ہم آہنگ ہو کر توحید کے نغمے بکھیریں۔ اس شوالے میں شاعر ایک سونے کی مورتی تخلیق کرنا چاہتا ہے جس کی صورت سندر، اور چھب موہنی ہو اور پھر:

"ہندوستان" لکھ دیں ماتھے پہ اس صنم کے — بھولے ہوئے ترانے دنیا کو پھر سنا دیں

یہ اس دور کی نظم ہے جسے عرفِ عام میں اقبال کا "وطن پرستی" کا دور کہا جاتا ہے۔ شاعر جغرافیائی حدود کے حوالے سے اپنی شناخت کے عمل سے گزر رہا ہے۔ اگر اس نظم اور اس دور کی دوسری نظموں مثلاً ہمالہ، ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، کو اقبال کے نظریۂ وطنیت کی بنیاد بنا لیا جائے تو یہ ہماری غلط فہمی ہوگی کیونکہ ایک تو شاعر کے ایک خاص دور کے خیالات کو اس کے عمومی خیالات قرار نہیں دیا جا سکتا، دوسرے خود "بانگِ درا" ہی میں ہمیں اس قسم کے اشعار بھی مل جاتے ہیں:

یہاں کہاں ہم نفس میسر، یہ دیس نا آشنا ہے اے دل — وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے کہ زیرِ خرخ کہن نہیں ہے

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا　　　　بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

کہاں کا آنا کہاں کا جانا فریب ہے امتیازِ عقبیٰ　　　　نمود ہر شے میں ہے ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے　　　　جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہاں اقبال وطن کے اس تصور کو پیش کر رہے ہیں جس کی اساس نظریۂ اسلامی ہے اور جس کے باشندے بقول اقبال :

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے　　　　اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

یعنی جغرافیائی حدود سے ماورا ہیں کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر، وطنیت کو جغرافیائی حدود سے مجسم نہیں کرتا، وطن کی جغرافیائی حوالے سے تجسیم مغربی تصور ہے اور علامہ اقبال اپنی شاعری کے پہلے دور کی چند نظموں کے علاوہ اپنے کلام میں اور دوسری جگہوں پر اس تصور کو رد کرتے ہیں۔ اپنے لیکچر "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" میں اقبال نے مغربی تصورِ وطنیت کے مقابلے میں اسلامی تصور کی وضاحت یوں کی ہے :

مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراکِ زبان ہے نہ اشتراکِ وطن، نہ اشتراکِ اغراض اقتصادی، بلکہ لوگ اس برادری میں جو رسالت مآبؐ نے قائم فرمائی ہے اس لیے شریک ہیں کہ مظاہرِ کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکے میں پہنچی ہیں وہ بھی ہم سب کے لیے یکساں ہیں۔ اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کا دارومدار ایک خاص تہذیبی تصور پر ہے جس کی تجسیمی شکل وہ جماعت مشخص ہے جس میں بڑھنے اور پھیلنے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے، اسلام زبان و مکان کی قیود سے مبرا ہے۔[1]

اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق مسلمانوں کا تصورِ قوم تاریخی ہے نہ کہ جغرافیائی۔ ہماری نظریاتی بنیادیں وطنیت کے تصور کو استوار کرتی ہیں۔ خاکِ وطن کے ہر ذرے کو دیوتا مان کر ہم اپنے آپ کو جغرافیے کی سلطنت میں محدود کر لیتے ہیں جبکہ تاریخ کی حدود بڑی وسعت رکھتی ہیں اور مسلمانوں کے

---

[1] ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر، ص: ۹

تصور کو استوار کرتی ہیں ۔ خاکِ وطن کے ہر ذرے کو دیوتا مان کر ہم اپنے آپ کو جغرافیے کی سلطنت میں محدود کر لیتے ہیں جبکہ تاریخ کی حدود بڑی وسعت رکھتی ہیں اور مسلمانوں کے نظریۂ ریاست کی تشکیل اسی حوالے سے ہوتی ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ وطن سے محبت نہ کی جائے ۔ وطن کی محبت تو ایک فطری جذبہ ہے اور اسلام دینِ فطرت ہے اور اس جذبے کو ہرگز رد نہیں کرتا، البتہ وطن کو اگر ایک سیاسی تصور کے طور پر لیا جائے تو یہ اسلامی اصولوں کے خلاف ہوگا ۔ مولانا حسین احمد مدنی کے نقطۂ فکر کے جواب میں علامہ اقبال نے اس سلسلے میں یوں وضاحت کی ہے :

"ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں ۔ ہم سب کرۂ ارض کے اس حصے میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے ۔ علیٰ ہذا القیاس چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ وطن کا لفظ جو اس قول میں مستعمل ہوا ہے محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے، اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا، اس کے حدود آج کچھ ہیں اور کل کچھ ۔ کل تک اہلِ برہما ہندوستانی تھے، آج برمی ہیں ۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدرِ اپنی بساط کے اس کے لیے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے ۔ بعض نادان لوگ اس کی تائید میں "حب الوطن من الایمان" کا مقولہ حدیث سمجھ کر پیش کیا کرتے ہیں حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ وطن کی محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے جس کی پرورش کے لیے اثرات کی کچھ ضرورت نہیں، لیکن زمانۂ حال کے سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ وطن ایک اصول ہے ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے ۔

علامہ اقبال جس قسم کی اسلامی ریاست کی تشکیل کے خواہاں تھے، پروفیسر آر ۔ اے ۔ نکلسن نے "اسرارِ خودی" کے انگریزی ترجمے کے دیباچے میں اس جانب یوں اشارہ کیا ہے :

"وہ ایک نئے حرم (مکہ) کی تعمیر میں مصروف ہے ..... اس نئی بستی سے مراد ایک عالمگیر مذہبی مثالی ریاست ہے جس میں دنیا بھر کے مسلمان نسل و وطن کی قید سے بے نیاز ہو جائیں ۔ وہ استعماریت اور وطنیت دونوں کا مخالف ہے ۔ وہ جس ریاست کا خواب دیکھتا ہے، اس میں دین کی بادشاہت ہوگی ۔

۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں علامہ اقبال نے پہلی مرتبہ اپنی

اسی مثالی ریاست کی عملی تشکیل کی جانب قدم اٹھایا اور واضح طور پر اعلان کیا:

ہندوستان میں ایک متوازن اور ہم آہنگ قوم کے نشوونما کی طرح مختلف ملتوں کا وجود ناگزیر ہے، مغربی ممالک کی طرح ہندوستان کی یہ حالت نہیں کہ اس میں ایک قوم آباد ہو، وہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہو اور اس کی زبان بھی ایک ہو۔ ہندوستان مختلف اقوام کا وطن ہے، جن کی نسل، زبان، مذہب ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ذرا غور سے دیکھا جائے تو ہندوستان میں کوئی واحد الجنس قوم نہیں، پس یہ امر کسی طرح بھی نامناسب نہیں کہ مختلف ملتوں کے وجود کا خیال کیے بغیر ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کریں۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے خواہ یہ ریاست سلطنتِ برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے خواہ اس کے باہر۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم اسلامی ریاست، قائم کرنا پڑے گی۔[۲]

اس اقتباس کو پڑھنے کے بعد جو بنیادی حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اقبال مملکت کی اساس نہ تو رنگ و نسل کے اشتراک کو قرار دیتے ہیں نہ مشترکہ زبان و قومیت کو، بلکہ ان کے نزدیک مذہب، مملکت کی تشکیل میں اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس بنیاد کے طے ہو جانے کے بعد اب یہ دیکھنا ہے کہ علامہ اقبال اس مملکت کی تشکیل کس ڈھانچے کے تحت کرنا چاہتے تھے۔ اس موضوع کو زیر بحث لانے سے پیشتر خطبۂ الہ آباد کا یہ اقتباس قابلِ توجہ ہے:

"میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازنِ قوت کی بدولت امن و امان ہو جائے گا، اور اسلام کو اس امر کا موقعہ ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر مدتوں سے طاری ہے۔

اس اقتباس میں دو باتیں خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ عربی شہنشاہیت اسلامی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم کے لیے جمود کا باعث ہوئی اور اس نے مسلمانوں پر منفی اثرات مرتب کیے۔

---

۲ خطبہ الہ آباد

۲۔ اسلام ایک تمدنی قوت ہے جس کی اساس قرآنِ حکیم کے بتائے ہوئے اصول ہیں۔

یہاں بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال شہنشاہیت پر جمہوریت کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن جمہوریت سے مراد مغربی جمہوری نظام ہرگز نہیں ہے کیونکہ اس نظام پر تو علامہ صاحب واضح طور پر تنقید کرتے ہیں:

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری (ضربِ کلیم)

متاعِ معنی بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی — ز دوراں شوخیٔ طبعِ سلیمانے نمی آید
گریز از طرزِ جمہوری غلام پختہ کار شو — کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

مغربی جمہوری نظام بھی اقبال کے نزدیک "سازِ کہن" یعنی شہنشاہیت ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ اقبال تو اس نظامِ حکومت کے قائل ہیں جس میں حاکمِ مطلق اللہ تعالیٰ ہے اور اقتدارِ اعلیٰ اس کی امانت ہے جو منتخب افراد کے ہاتھوں اسی کے دیے ہوئے نظام کو چلاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے — حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

اس بنیادی نظریے کو سامنے رکھتے ہوئے علامہ اقبال جمہوریت کی حمایت کرتے ہیں۔ اپنے خطبات میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

"جمہوری طرزِ حکومت اسلام کی روح کے عین مطابق ہے۔"[۳۵]

اس کی مزید وضاحت انھوں نے اپنے مضمون "اسلام بحیثیت ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین" میں یوں کی ہے:

ہم جانتے ہیں کہ اسلام محض ایک مجموعۂ عقائد نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر کچھ اور بھی ہے۔ یہ ایک امت ہے، ایک قوم ہے، امت کی حیثیت سے اسلام کی رکنیت کا تعلق نہ پیدائش سے ہے، نہ مقامیت سے، نہ وطنیت سے بلکہ یہ رکنیت عبارت ہے عقائد کے اشتراک سے ..... ایسی

---

۳۵ تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامی

امت کے لیے بہترین طرزِ حکومت جمہوریت ہی ہوگی جس کا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ جہاں تک عملی طور پر ممکن ہو آزادی فراہم کر کے آدمی کو اپنی فطرت کے تمام ممکنات کو ترقی دینے کا موقع دیا جائے۔ اسلام کا اہم ترین پہلو بحیثیت ایک سیاسی نصب العین جمہوریت ہے[۱۹]

صحیح صورت حال یہ ہے کہ علامہ اقبال اصولی طور پر جمہوریت کے حامی ہیں لیکن مغرب میں اس نظام کی عملی صورت دیکھتے ہوئے اس سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ ان کے نقطۂ نظر کے مطابق جمہوریت کے لیے اخلاقی اور روحانی صفات سے متصف ہونا ضروری ہے کہ ان صفات کے بغیر وہ "جمہوری قبا" میں "دیو استبداد" کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ اس جمہوری مملکت کو علامہ جن اصولوں اور ضابطوں کے تحت چلانا چاہتے ہیں ان کا منبع و ماخذ یعنی سرچشمہ کیا ہے؟

علامہ اقبال کے کلام اور خطبات کا بغور جائزہ لینے کے بعد ہم بآسانی اس نتیجے تک پہنچ سکتے ہیں کہ ان کے نزدیک اس اسلامی ریاست کے دستور و قوانین کا سرچشمہ قرآنِ حکیم ہے۔ "رموزِ بے خودی" میں "در معنی ایں کہ نظام ملت غیر از آئین صورت نہ بندد و آئینِ ملتِ محمدیہ قرآن است" کے زیرِ عنوان اقبال کہتے ہیں:

تو ہمی دانی کہ آئین تو چیست؟ زیرِ گردوں سرِ تمکین تو چیست
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم حکمت اُو لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن

ان بنیادوں پر قائم ہونے والی مملکت اقبال کے نزدیک صحیح معنوں میں ایک اسلامی ریاست قرار دی جا سکتی ہے مگر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اقبال قرآنِ حکیم کے اس فیصلے کو کہ:

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۔ قُلِ الْعَفْوَ ؕ

آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، کہہ دیجیے اپنی ضروریات سے جو کچھ زائد ہو۔

اس ریاست کی تشکیل میں ایک اہم عنصر قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

---

[۱۹] ہندوستان ریویو، جلد: ۲۰، ۱۹۰۹ء

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار
جو حرفِ قُلِ العفو میں پوشیدہ ہے اب تک اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

علامہ اقبال حرف "قل العفو" میں پوشیدہ حقائق کی عملی صورت کو اس ریاست میں رائج دیکھنا چاہتے ہیں یعنی وہ اسلامی عدل کے اصولوں کے مطابق ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں معاشی انصاف ہو اور جس کا تمدن سرمایہ دارانہ نظام سے آزاد ہو۔ کیونکہ یہ نظام بقول اقبال :

تدبر کی جنوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

اقبال معاشرے میں محنت کو امتیاز کی بنیاد قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں یہ عین اسلامی ہے، اور معاشی انصاف کے لیے قرآنِ پاک میں واضح ہدایات واحکام موجود ہیں۔ ان احکام ہی کے پیشِ نظر اقبال فرماتے ہیں :

کارخانے کا ہے مالک مردکِ ناکردہ کار عیش کا پتلا ہے محنت ہے اسے ناسازگار
حکمِ حق ہے لَیسَ لِلاِنسانِ اِلّا مَا سعیٰ کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

اس سلسلے میں علامہ اقبال نے قائدِ اعظم کو ایک خط لکھا تھا جس میں اس مسئلے کی پوری طرح وضاحت کی تھی۔ اس خط کا یہ اقتباس اگرچہ طویل ہے مگر فکرِ اقبال تک رسائی کے لیے اس کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ اقبال نے لکھا تھا :

"آپ کا خط موصول ہوا۔ اس کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں۔ مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ مسلم لیگ کے پروگرام اور آئین میں تبدیلیوں کے بارے میں مَیں نے اپنے خط میں جو کچھ لکھا تھا، اُسے آپ فراموش نہیں کریں گے۔ مجھے اس امر میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ آپ کو مسلم انڈیا کی نزاکت کا پورا طرح احساس ہے۔ مسلم لیگ کو آخر کار اس کا فیصلہ کرنا ہی پڑے گا کہ آیا یہ صرف ایک ایسی جماعت رہے گی جو صرف مسلمانوں کے بالائی طبقوں کی نمائندگی کرے یا وہ مسلمان عوام کی نمائندہ تنظیم بنے گی جنھیں ابھی تک بعض ٹھوس وجوہ کی بنا پر لیگ سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے ذاتی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ کوئی سیاسی تنظیم جو عام مسلمانوں کی مادی حالت سدھارنے کا وعدہ نہ کرے وہ عوام کے لیے باعثِ کشش ہرگز نہیں ہو سکتی ..... عام طور پر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ

ان کے غربت و افلاس کا اصل باعث سود خور ہندو ساہوکار یا سرمایہ دارانہ نظام ہے، تاہم ان میں ابھی یہ شعور پیدا نہیں ہوا کہ مسلمانوں کی اس بدحالی اور افلاس کی وجوہ میں ایک اہم وجہ غیر ملکی حکومت اور تسلط بھی ہے مگر ان کے اندر اس احساس و شعور کا پیدا ہونا لازمی اور ناگزیر ہے۔ اس کا امکان بہت کم ہے کہ مسلمان جواہر لال نہرو کے بے دین سوشلزم کی طرف کچھ زیادہ مائل ہوں۔ چنانچہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا حل کیا ہے اور اس مسئلے کو کیوں کر حل کیا جا سکتا ہے؟ میرے نزدیک مسلم لیگ کے مستقبل کا انحصار لیگ کی طرف سے اس سوال کو سرگرمی کے ساتھ حل کرنے میں ہے۔ اگر مسلم لیگ مسلمانوں سے اس مسئلے کو حل کرنے کا وعدہ کرنے میں ناکام رہتی ہے تو میں یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ پہلے کی طرح آئندہ بھی مسلمان عوام، لیگ سے بے تعلق اور دور ہی رہیں گے۔ مگر یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس مسئلے کو اسلامی قوانین کے نفاذ نیز جدید نظریات و خیالات کی روشنی میں ان قوانین کو مزید بہتر بنا کر حل کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی قوانین کے طویل مطالعے اور اس بارے میں گہرے غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اس قانونی نظام کو مناسب طور پر سمجھا اور اس کا اطلاق کیا جائے تو آخر کار کم از کم ہر شخص کے لیے لازمی ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کی ضمانت دی جا سکتی ہے ..... میرے نزدیک یہ امر واضح ہے کہ اگر ہندو مت سوشل ڈیموکریسی کو قبول کر لیتا ہے تو یہ یقینی طور پر ہندو مت نہیں رہے گا مگر اسلام کے لیے مناسب صورت اور اسلام کے قانونی اصولوں کی مطابقت میں سوشل ڈیموکریسی کا اختیار کرنا کوئی انقلاب نہ ہوگا بلکہ اسلام کے اصل اور پاکیزگی کی طرف مراجعت ہوگی چنانچہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لیے جدید مسائل کو حل کرنا زیادہ آسان ہوگا ..... [۵۵]

اس خط کے مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ علامہ اقبال اس اسلامی ریاست میں ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں جو اسلامی تاریخ کے دورِ اول میں قائم ہوا تھا۔ جس میں مدینے کی گلیوں سے سائل ناپید ہو چکے تھے، دینے والے ہاتھ لینے والے ہاتھوں سے زیادہ

---

۵۵ مکتوب محررہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷

تھے۔ یہ سب پیغمبر اسلامؐ کی تعلیمات اور مساعات محمدی کا اثر تھا۔ اقبال اس اعلیٰ اسلامی معاشرتی ڈھانچے کو عصر حاضر کے حالات اور تقاضوں کے مطابق قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں بھی اقبال کا اجتہادی نقطۂ نظر واضح طور پر جھلکتا ہے۔ اقبال فکر و عمل میں اجتہاد کے قائل ہیں۔ اسی لیے اسلامی قوانین کو بنیاد بنا کر جدید دور کے نظریات کا جائزہ لیتے ہیں اور معروضی صورت حال کے مطابق مسلمانوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔

اور ایک آخری بات یہ کہ علامہ اقبال تہذیبی و تمدنی حوالے کو بھی خصوصی اہمیت دیتے ہیں۔ وہ اسلامی ثقافت کے احیا کو اس اسلامی ریاست کا ایک اہم وظیفہ قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں اسلام محض عقائد ہی کا مجموعہ نہیں ہے، زندگی کا مکمل لائحہ عمل بھی ہے۔ چنانچہ جہاں خطبۂ الہ آباد میں علامہ نے اس جانب اشارہ کیا ہے، وہیں قائد اعظم کو ایک خط میں بھی لکھتے ہیں:

"یہ امر لابدی ہے کہ ہندوستان اور بیرون ہندوستان کی دنیا کو صاف صاف بتا دیا جائے کہ ہندوستان میں حل طلب مسئلہ صرف معاشی مسئلہ ہی نہیں ہے بلکہ ہندی مسلمانوں کی اکثریت کی نگاہ میں ہندوستان میں تہذیب اسلامی کا مستقبل اگر معاشی مسئلے سے زیادہ اہم نہیں تو اس سے کس طرح کم اہمیت کا حامل بھی نہیں ہے"[1]

اس تمام بحث کو ہم یوں سمیٹ سکتے ہیں کہ اقبال کے نزدیک وہ ریاست صحیح معنوں میں اسلامی ریاست قرار دی جا سکتی ہے، جس میں معاشی انصاف ہو، اسلامی تہذیب و ثقافت کا احیا ہو، جمہوریت اور آزادی ہو اور جس کا مرکز قوانین الٰہی (یعنی قرآن حکیم اور سنت رسولؐ) ہو کہ مرکز کے بغیر قومیں زندہ نہیں رہ سکتیں، بقول اقبال:

قوموں کے لیے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحب مرکز تو خودی کیا ہے؟ خدائی

---

[1] مکتوب محررہ ۲ مارچ ۱۹۳۷